(سفرنامہ)

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

بحیرہ عرب سے بحر احمر تک

مسجد اقصیٰ و مشرق وسطیٰ میں بارہ دن

(فلسطین/شام/اردن اور مصر کا تاریخی سفر، مشاہدات وتاثرات)

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانب اقصیٰ:

کوئی اگر مجھ سے پوچھے میری اب تک کی ۴۲/ سالہ زندگی کی خوشگوار یادیں اس خطہ ارضی کے کن گوشوں سے وابستہ ہیں تو نیند کی حالت میں بھی مجھ سے کیے جانے والے اس سوال کا جواب شاید یہی ملے کہ حرم مکی و حرم مدنی کی معطر فضاؤں میں گذرے لمحات کے بعد میری زندگی کا یادگار دن گذشتہ سال شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ کا پہلا جمعہ تھا، جب اللہ رب العزت نے مجھے خیالی دنیا سے حرم ثالث اور مسجد اقصیٰ کی حقیقی دنیا میں پہنچا دیا تھا، اقصیٰ کی مقدس سرزمین سے راقم الحروف کا ہمیشہ بچپن ہی سے جذباتی تعلق رہا، میری تصنیفی زندگی کا باقاعدہ آغاز بھی ۲۳/ سال کی عمر میں مسجد اقصیٰ کی پکار کے نام سے ایک رسالہ سے ہوا، جس کا اجراء بھی مخدومی و مربی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے دست مبارک سے فرمایا، جن کے قضیہ فلسطین و مسجد اقصیٰ سے والہانہ تعلق کی مثال عالم اسلام کے ان کے معاصر علماء و دعاۃ میں بھی مشکل ہی سے ملتی ہے، میرے ان اساتذہ نے جن کی توجہات کا میری حقیر ذات کی تربیت میں بڑا حصہ رہا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا سید سلمان صاحب حسینی ندوی، مولانا فاروق صاحب ندوی اور مولانا ناصر صاحب اکرمی جامعی، یہ وہ لوگ تھے جن کی مجالس و دروس اور خطبات بیت المقدس کے ذکر سے شاذ و نادر خالی ہوتے، ان سب کا نتیجہ ہوا کہ طالب علمی سے اب تک اللہ تعالیٰ سے کی جانے والی میری دعاؤں میں الحمدللہ اقصیٰ کی آزادی کے لیے دعا نہ صرف ہمیشہ شامل رہی، بلکہ سرفہرست اور مقدم ہی رہی، مجھے یاد نہیں آتا کہ ائمہ حرم نے کبھی اپنے خطبات و دعاؤں میں مسجد اقصیٰ کا نام لے کر دعا کی ہو اور میری آنکھوں سے شدت جذبات سے آنسو نہ بہے ہوں، اقصیٰ سے اس جذباتی تعلق کی وجہ سے مجھے اپنے ارحم الراحمین مولیٰ سے اس بات کی قوی امید تھی کہ وہ حرم ثالث میں حاضری کی میری التجاؤں کو ضرور سن لے گا، رحمت الٰہی جب جوش میں آتی ہے تو گناہ گار بندوں کے حق میں بھی اس کے انعام واکرام کے فیصلے ہونے لگتے ہیں، جس کا ایک ہلکا سا نمونہ میری حقیر ذات تھی، گذشتہ سال شعبان کے اوائل میں جمعہ کے دن میں مسجد اقصیٰ کے صحن میں کھڑا تھا اور مجھ کو خود اپنی ذات کے متعلق یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ

میں کہاں ہوں، میں ٹکٹکی مار کر وہاں کی معطر فضاؤں میں کھڑے ہو کر کبھی اقصی کے منور گنبد کو دیکھ رہا تھا اور کبھی قبۃ الصخرہ کی سنہری حسین وجمیل عمارت کو، اپنی تمناؤں کے مرکز اور آرزوؤں کے محور حرم ثالث میں اپنے آپ کو پا کر خوشی سے میں پھولے نہیں سمار ہا تھا اور ان حسین لمحات پر مجھ کو خواب کا شبہ ہو رہا تھا، اس مبارک گھڑی کی اس روحانی کیفیت کو میں اب الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ اس سال حیدر آباد ہندوستان سے قرآنی مقامات کی زیارت کو جانے والے ہندوستانی قافلہ میں ارحم الراحمین آقا نے میرا بھی نام لکھ دیا ہے، اس سے ایک سال پہلے بھی جب اس طرح کا ایک گروپ ہمارے ملک سے ان تاریخی مقامات کی زیارت کے لیے جانے والا تھا تو میں نے اس میں شامل ہونے کے لیے اپنے سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی سے اس میں شامل ہونے کی اجازت طلب کی تو حضرت مولانا نے مجھے اس وقت کے حالات کی وجہ سے جانے کی اجازت نہیں دی، لیکن جب میں نے دوبارہ اس دوسرے قافلہ کے ساتھ جانے کی اجازت مانگی تو مولانا نے بخوشی مجھے اس میں شامل ہونے کا پروانہ عنایت فرمایا، چنانچہ میں نے فوراً اس گروپ کے ذمہ داروں سے رابطہ کر کے میرے سفر کی کاروائی کا آغاز کرنے کا عندیہ دے دیا اور پیشگی تقریباً ایک لاکھ روپے بھی جمع کر دیئے، چار ممالک پر مشتمل ۱۲/ دن کا یہ سفر تھا، جس میں شام/ اردن/ فلسطین اور مصر کے تاریخی مقامات کی زیارت شامل تھی۔

یہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں: ۲۷/ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ کو جو حسن اتفاق سے معراج کی شب والا دن تھا، میں منزل معراج کی زیارت کے لیے گھر سے نکلا اور کیرلہ کے تجارتی مرکز کالی کٹ ائیر پورٹ سے بحرین ائیر ویز کے ذریعہ اپنے قافلہ کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا، بھٹکل سے ایرپورٹ تک رفیق محترم مولانا نعمت اللہ صاحب ندوی اور کیرلا سے مولانا ابراہیم صاحب خلیفہ ندوی ساتھ تھے، پہلے ہم لوگ شام پہنچے اور وہاں دمشق میں دو دن گذار کر اردن آئے اور وہاں کے تاریخی مقامات کو دیکھنے کے بعد فلسطین پہنچے، جہاں چار دن ہمارا قیام رہا، پھر وہاں سے مصر گئے، لیکن اس سفرنامہ کا اس وقت آغاز ہم بیت المقدس کی اپنی تاریخی اہمیت کی وجہ سے فلسطین ہی سے کر رہے ہیں، شام/ اردن اور مصر اور پھر دو ماہ بعد ہونے والے جاپان، سنگاپور، ملیشیاء اور تھائی لینڈ کے دعوتی دورہ کے تاثرات ومشاہدات انشاء اللہ اگلی قسطوں میں آپ ملاحظہ کر سکیں گے۔

سرزمین انبیاء میں: فلسطین کے اکثر حصوں پر اس وقت اسرائیل کا قبضہ ہے، البتہ چند شہروں غزہ، جنین، رملہ، جریکو اور بیت اللحم وغیرہ کو اس نے خود مختاری دی ہے، ہمارا دورہ چونکہ ان ہی فلسطینی علاقوں کا تھا اور ہمارے اس پورے سفر کا مقصود بیت المقدس کی حاضری تھی جس پر بدستور اسرائیل ہی کا قبضہ ہے، اس لیے اس میں داخلہ کے لیے ہمیں سرحد پر ان سے اجازت لینا ناگزیر تھا، خیر ہم اردن میں تاریخی مقامات پر حاضری کے بعد دوپہر کے کھانے سے

فارغ ہوکر ۴/ بجے کے قریب فلسطینی سرحد پر پہنچے، ہمارے گائیڈ نے ہمیں پہلے ہی باخبر کردیا تھا کہ ذہنی طور پر ہم اس کے لیے تیار رہیں کہ فلسطین میں داخلہ کا پروانہ شاید نہ ملے اور اگر ملے بھی تو شاید ہمیں گھنٹوں انتظار کرنا پڑے۔

جب ہم رات کو ۹/ بجے فلسطین کی سرحد میں داخل ہوئے تو اس کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوچکی تھی اور ہمیں ۵/ گھنٹے مسلسل سرحد پر تفتیش وتحقیق کے مراحل سے گذرنا پڑا، چونکہ ہم بیس آدمیوں کی یہ جماعت ہندوستان سے تعلق رکھتی تھی اور گروپ کی شکل میں ویزہ طلب کر رہی تھی اور فلسطین میں اپنے قیام کے نظام الاوقات اور ہوٹل بکنگ اور ٹرانسپورٹ کی تفصیلات بھی ساتھ تھی، اس لیے ہم میں سے ۱۴/ ۱۵/ افراد قافلہ کو آسانی سے داخلہ کی اجازت مل گئی، لیکن ہم ۷/ ۶ نوجوانوں کو جن کی عمریں ۴۲/ ۴۱ سال کے آس پاس تھیں ۵/ گھنٹے تک مسلسل انتظار کی ناقابل بیان کوفت سے گذرنا پڑا اور ہمارے، پاسپورٹ کے متعلق پانچ گھنٹے مسلسل تحقیق وتفتیش کی گئی، اس پورے پس منظر کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب وزارت خارجہ کی ایک خاتون نے یہ کہہ کر ہمیں اپنے پاسپورٹ تھمادیئے کہ آپ کی سیکورٹی سے متعلق ہرطرح کی ہماری جانچ مثبت نکلی ہے، اب آپ سرحد میں داخل ہوسکتے ہیں، تب مجھے یہ سمجھنے دیر نہیں لگی کہ اسرائیل کے تعلق والے تمام ممالک میں بلیک لسٹ میں مطلوب افراد کی ان کے پاس فہرست تھی اور ہمارے پاسپورٹ میں درج مختلف تفصیلات کا کبھی ہمارے نام سے، کبھی ہمارے والد کے نام سے، کبھی جائے پیدائش سے کبھی تاریخ پیدائش سے اور کبھی ہمارے شہر سے مختلف انداز سے اس کو جانچ کر اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کو اطمینان ہوا کہ ان پاسپورٹوں کے مسافرین کے نام ان کو مطلوبہ افراد سے میل نہیں کھاتے ہیں، اس پر ہم نے اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، ان پانچ گھنٹوں کے دوران ہم سے براہ راست کوئی تفتیش وتحقیق نہیں ہوئی، ہم سے مہذب انداز میں صرف اتنا کہا گیا کہ آپ ویٹنگ ہال میں انتظار کرلیں، اس دوران میری جو حالت تھی وہ ناقابل بیان تھی، میں نے صلاۃ الحاجہ پڑھی، گڑگڑا کر خوب دعائیں کیں اور جتنے ذکر واذکار اور روزمرہ کے وظائف یاد تھے اس کو بار بار پڑھا، اس ڈر سے کہ مبادا اللہ تعالی مجھے مقدس سرزمین میں اتنا قریب پہنچا کر کہیں مسجد اقصی کی زیارت سے اپنے گناہوں کی وجہ سے محروم نہ کردے، جب ہمیں ارض مقدس میں داخلہ کا پروانہ ملا تو ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، داخلہ کے لیے انہوں نے انٹری پاس کی پرچی دی تھی، اپنے پاسپورٹ پر ان کے امگریشن کی مہر نہ دیکھ کر مجھے اور دگنی خوشی ہوئی کہ ان کے قلم کی سیاہی سے الحمدللہ میرے پاسپورٹ کے کاغذات محفوظ رہے، یہی حال وہاں سے واپسی اور مصر میں داخلہ کے موقع پر تھا کہ پاسپورٹ پر خروج کی مہر لگانے کے بجائے ایگزیٹ پاس ہمارے ہاتھ میں تھمایا گیا۔

موجودہ فلسطین: تاریخ کی کتابوں میں پہلے زمانے میں جب ملک شام بولا جاتا تھا تو اس کا اطلاق مشرق وسطی کے موجودہ چار ممالک شام/ فلسطین/ اردن اور لبنان پر ہوتا تھا، بعد میں برطانیہ نے اس کو چار الگ الگ ملکوں میں تقسیم کردیا، فلسطین پر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) تک خلافت عثمانیہ یعنی ترکوں کا قبضہ رہا، ۱۹۱۷ء میں پہلی دفعہ

برطانوی افواج بیت المقدس میں داخل ہوئیں، اس کے بعد برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے اعلان کیا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام کے حامی ہیں، اس کے بعد آہستہ آہستہ بڑی منصوبہ بندی سے یہودیوں کو فلسطین میں لاکر بسایا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے امریکہ کے دباؤ میں آکر فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا اور ۵۵/ فیصد فلسطین کے مغربی حصہ پر اسرائیل قابض ہوگیا اور تل ابیب کو اپنا پایہ تخت بنایا، کچھ مہینوں کے بعد اس نے بیت المقدس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا، ۱۹۶۷ء میں دوبارہ عربوں کے ساتھ اپنی تاریخی جنگ کے بعد اسرائیل نے فلسطین کے بقیہ مشرقی حصہ پر بھی قبضہ کرلیا اور بیت المقدس بھی جواب تک اردن کی حکومت کے پاس تھا ان کے قبضہ میں چلا گیا، تب سے لے کر اب تک ارض مقدس پر اسرائیل کے ناجائز قبضہ کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

یوں تو دستوری طور پر اسرائیل نے اپنا پایہ تخت بیت المقدس (یروشلم) کو قرار دیا ہے، لیکن عملاً وانتظاماً اب تک تل ابیب ہی کو راجدھانی کی حیثیت حاصل ہے، اسرائیل اس وقت جن علاقوں پر قابض ہے اس کا رقبہ بیس ہزار سات سو مربع کلومیٹر ہے، جس کی آبادی ۷۰/ لاکھ کے قریب ہے، اس میں مسلمانوں کا تناسب مہاجرین کی ہجرت وجلاوطنی کے بعد صرف ۲۰/ فیصد رہ گیا ہے، جبکہ ۱۰/ فیصد عیسائی و دیگر مذاہب کے ماننے والے ہیں۔

فلسطین کی داخلی خودمختاری: فلسطین کے بعض حصوں کو عالمی دباؤ میں آکر اسرائیل نے ۱۹۹۳ء سے خودمختاری دی ہے، جس میں بیت اللحم، غزہ، جریکو، رملہ اور جنین وغیرہ کے علاقے شامل ہیں، اس معاہدہ پر فلسطین عوام کی مرضی کے خلاف اس وقت یاسر عرفات نے پی ایل او کی طرف سے امریکہ کی سرپرستی میں ناروے کے پایہ تخت اوسلو میں دستخط کیے تھے، اس سلسلہ میں عرفات کو اس معاہدہ پر مجبور کرنے والے الفتح اور پی ایل او عہدیداران کے متعلق کچھ ہی دنوں میں یہ راز فاش ہوا کہ وہ اسرائیل کے ایجنٹ تھے۔ مثلاً حنان میخائیل جو فلسطینی مسلم وفد کی سرکاری ترجمان تھی عیسائی تھی، تاویل عرفات کے خسر اور عیسائی تھے اور اسرائیل کے ساتھ خفیہ تعلقات رکھتے تھے، عرفات کی بیوی سہا تاویل عیسائی تھی اور اس کا اس معاہدہ پر اپنے شوہر کو مجبور کرنے میں بڑا دخل تھا، خود عرفات فلسطین کے اس جہاد کو فلسطینیوں کی ذاتی اور تہذیبی وفوجی جنگ کہتے تھے، ان حاصل کردہ فلسطینی علاقوں کی اس خودمختاری کا مطلب بھی صرف داخلی آزادی تھی یعنی انتظامیہ، پولس، عدلیہ اور بینک وغیرہ کے نظام کو فلسطینی حکومت کو سنبھالنا تھا، ان کو اپنی فوج اور دفاع کا حق نہیں تھا، دوسرے الفاظ میں فلسطین کی مکمل آزادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، ۲۰۰۴ء میں یاسر عرفات کی وفات کے بعد محمود عباس نے الفتح کی قیادت سنبھالی، ۲۰۰۶ء میں فلسطین کے داخلی انتخابات میں فلسطینی عوام نے الفتح کے مقابلہ میں حماس کے ممبران کو منتخب کیا، لیکن محمود عباس اب تک صدارت کی کرسی پر امریکہ اور یورپی ممالک کے اشارہ پر حماس کو اقتدار سے آنے سے روکنے کے منصوبہ کے تحت بدستور قابض ہیں، فلسطین کی خودمختار حکومت کا دارالسلطنت تاریخی شہر رملہ ہے، جس کو سلیمان بن عبدالملک نے بسایا تھا اور دمشق کی جامع اموی کے طرز پر ایک خوبصورت مسجد یہاں تعمیر کی تھی جس کو ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس کی خوبصورتی کی وجہ سے جامع ابیض

سے تعبیر کیا ہے، بعض روایات کے مطابق اس شہر کے آس پاس تین سو انبیاء کرام کی قبریں ہیں۔

بیت اللحم میں ہمارا قیام: ہم لوگ رات دس بجے کے قریب بیت اللحم میں اپنی قیام گاہ ہوٹل شیفرڈ پہنچے جو ایک چار ستارہ ہوٹل تھا، ہوٹل کے گائیڈ نے سرحد ہی سے ہوٹل کی بس میں ہمیں سوار کرادیا تھا، بیت اللحم بیت المقدس شہر سے تقریباً ۱۵/کلومیٹر کے فاصلہ پر سطح سمندر سے ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر واقع وہ تاریخی شہر ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی، اسی لیے پوری دنیا میں کیتھولک عیسائیوں کا یہ سب سے بڑا مقدس و متبرک مقام ہے ،عالمی سطح پر ہر سال ۲۵/ دسمبر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر کرسمس کا جو جشن منایا جاتا ہے اس کا مرکز یہی ہے، بعض روایتوں کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام کی جائے پیدائش بھی یہی شہر ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس شہر میں کھجور کا وہ درخت اب تک موجود تھا جس کا پھل حمل کے دوران حضرت مریمؑ نے کھایا تھا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، ہم نے اس چرچ کو تفصیل سے اندر جا کر بھی دیکھا، اس میں موجود ایک چھوٹے سے تہہ خانہ میں موم بتیاں ہمیشہ جلتی رہتی ہیں اور یہی کمرہ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش بتایا جاتا ہے، اپنے دروازوں اور پتھروں کی بوسیدگی کی وجہ سے یہ چرچ سینکڑوں نہیں ہزاروں سال پرانا معلوم ہوتا ہے، ہر وقت دنیا بھر کے عیسائیوں کی بھیڑ یہاں جمع رہتی ہے، شادیوں کے لیے عالمی سطح پر کیتھولک عیسائی اس جگہ کو بابرکت سمجھتے ہیں اور لباس عروسی میں ہمیشہ کچھ جوڑے سال بھر یہاں نظر آتے ہیں ہم جب اس جگہ پہنچے تو کئی جوڑے اس رسم کو انجام دیتے ہوئے نظر آئے ،اس کلیسا کا نام NETEVATY CHURCH ہے۔ ۲۵/ دسمبر کو ہر سال حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے موقع پر اس گرجا گھر میں ایک کلچرل پروگرام ہوتا ہے جس میں رقص و سرور کی محفلیں جمتی ہیں، ہمیں یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ فلسطین کے موجودہ صدر محمود عباس بڑے اہتمام سے اس تقریب میں شرکت کرتے ہیں۔

سیدنا ابراہیمؑ کی آخری آرام گاہ میں: حمرون میں فلسطین میں ہمارے چار روزہ قیام کے دوسرے دن کا یعنی بالفاظ دیگر ہمارے اس تاریخی سفر کا باضابطہ آغاز صبح کو حمرون کے تاریخی شہر سے ہوا جہاں آج سے چار ہزار سے دو ہزار سال تک کے دوران اس روئے زمین پر انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونے والے اکثر انبیاء کرام کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آخری آرامگاہ ہے، یہ شہر بیت المقدس شہر سے تقریباً ۱۲/کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے یہاں غالب مسلم آبادی کے باوجود اسرائیل نے رملہ، غزہ اور حمرون کی طرح اس کو خودمختاری نہیں دی ہے ،اس کی وجہ غالباً بڑی تعداد میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں مبعوث ہونے والے انبیاء کرام کے یہاں موجود وہ مزارات ہیں جو یہودیوں کے لیے بھی مسلمانوں کی طرح مقدس و قابل احترام ہیں، جب ہم یہاں پہنچے تو عجب ہو کا عالم تھا اور ہر جگہ سناٹا تھا، اکثر دوکانیں اور مکانات بھی بند تھے، کرفیو کا سماں لگ رہا تھا، کچھ لوگ جو باہر گلیوں میں نظر آرہے تھے سہمے سہمے لگ رہے تھے، ان کے چہروں پر مسکنت و فقر و فاقہ کا اثر نمایاں تھا، ہر جگہ اسرائیلی فوج کے چیک پوسٹ تھے اور مختلف ناکوں پر وہ مورچہ سنبھالے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ اس شہر میں آباد مسلمانوں کی اسرائیلی

فوج کے ساتھ ہمیشہ جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں، مزار سیدنا ابراہیمؑ اور مسجد الخلیل ایک پہاڑ پر واقع ہے، اس لیے سیاحوں کو دور ہی اپنی گاڑیاں روک کر کچھ چل کر وہاں پہنچنا ہوتا ہے، جب ہماری بس یہاں پہنچی تو اس کے قریب میدان میں فلسطینی بچے جو نہایت خوبصورت وحسین وجمیل تھے، لیکن چہرے گرد آلود اور بال بکھرے ہوئے تھے ہم کو بس سے اترتے دیکھ کر دوڑے دوڑے ہمارے ارد گرد جمع ہوگئے اور بھیک مانگنے لگے، حرم ابراہیمی یعنی مسجد الخلیل کچھ اونچائی پر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا وہاں پہنچنے تک ہم لوگوں کو سیکورٹی کے کئی مراحل اور چیک پوسٹوں سے گذرنا پڑا، جگہ جگہ روکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں، داخلی دروازہ پر میٹل ڈیٹیکٹر تھا، ان سب مراحل سے گذر کر ہم مسجد الخلیل میں داخل ہوئے ، وہاں پہنچتے ہی سکون واطمینان کی جو کیفیت ہم پر طاری ہوئی وہ بیان سے باہر تھی، عجیب پرسکون فضاء تھی، مسجد میں داخل ہوکر ہم نے پہلے دوگانہ ادا کی اور اس نعمت عظمی پر اللہ تعالی کا شکریہ ادا کیا اور دعا سے فارغ ہوکر تیز قدموں سے سب سے پہلے اللہ تعالی کے محبوب نبی اور چہیتے رسول اور خود ہمارے آقا و سرکار دو عالم ﷺ کے جدامجد سیدنا ابراہیمؑ کے مزار پر حاضری دی اور جی بھر کر دعائیں کیں اور سلام بھی ایک دفعہ نہیں کئی کئی بار، نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام اساتذہ ورفقاء اور رشتہ داروں کی طرف سے پیش کیا، مسجد کے اندرونی ہال میں ترتیب سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت سارہؓ اور حضرت اسحاقؑ ان کی زوجہ حضرت رفقہؓ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی زوجہ حضرت لائقہؓ کی قبریں ہیں، ہر نبی سے متصل ان کی اہلیہ کی قبر ہے، سوائے حضرت یعقوبؑ کے مزار کے جو ایک کمرہ میں مقفل ہے تمام مزارات کی زیارت کی جاسکتی ہے، حضرت یعقوبؑ چونکہ یہودیوں کے براہ راست جدامجد ہیں اور ان ہی کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے اسی لیے غالباً حکومت نے ان کے مزار کو عام مذاہب کے لوگوں کے بجائے اپنے لیے خاص رکھا ہے، عام مسلمانوں کے لیے صرف سال میں ایک دفعہ معراج کے دن یعنی یوم اسراء ۲۷/رجب المرجب کو وہاں جانے کی اجازت دی جاتی ہے، حضرت یوسفؑ کی والدہ راحیلہ کی قبر جو حضرت یعقوبؑ کی دوسری بیوی تھی حبرون سے بیت اللحم جاتے ہوئے راستہ میں ہے، اسی طرح مسجد الخلیل کے باہر واقع ایک غار میں حضرت یوسفؑ کی قبر بتائی جاتی ہے جہاں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے، لیکن میرے لیے اس پر یقین کرنا اس لیے مشکل تھا کہ مصر سے جہاں کے حضرت یوسفؑ گورنر تھے فلسطین سے واپس جا کر وہاں ان کی وفات کا تاریخ میں ثبوت نہیں ملتا، مسجد الخلیل کے اندرونی نظام کو سرکاری فلسطینی مسلمان سنبھالے ہوئے ہیں، جن کی تنخواہیں وغیرہ اسرائیلی حکومت ہی ادا کرتی ہے، مسجد کے کنارہ واقع ان کے دفتر میں جانے اور وہاں کے ذمہ داروں سے تفصیلی گفتگو کا بھی ہمیں موقع ملا، لیکن افسوس کہ وہ اس تاریخی مسجد کی اہمیت وعظمت کی تفصیلات ہمیں بتانے کے بجائے اپنی کم تنخواہوں کا رونا رو رہے تھے، دوسرے الفاظ میں ہم سے بخشش وخیرات کے طالب تھے۔

دنیا کے سب سے قدیم شہر اریحا (جریکو) میں: ہم لوگ حبرون کے تاریخی مقامات وزیارتوں سے فارغ

ہو کر ظہر کی اذان کے وقت حمرون پہنچے اور وہاں ایک مقامی مسجد میں نماز ادا کی جہاں مصلیوں کی تعداد وہاں کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی، ۱۹۹۳ء میں اسرائیل نے پہلے فلسطین کے جن دو مسلم اکثریتی شہروں کے لیے خود مختاری کا اعلان کیا تھا اس میں غزہ کے ساتھ جریکو بھی تھا، تاریخ وتفسیر کی کتابوں میں اس شہر کا نام اَریحا ملتا ہے، مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ اس وقت دنیا میں آباد شہروں میں سب سے قدیم شہر ہے جس کی تاریخ آٹھ ہزار سال پرانی ہے، اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے یہ پوری دنیا میں روئے زمین کا سب سے نچلی سطح پر یعنی سطح سمندر سے بھی ۴۱۰ میٹر نیچے واقع شہر ہے، یہ بیت المقدس سے ۳۵/ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے اور اس کے دائیں جانب دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہی بحر میت ملتا ہے، اردن سے فلسطین میں جب آپ بیت المقدس جانے کے لیے داخل ہوں گے تو جریکو آپ کو راستہ میں ملیگا، یہ بڑا سرسبز وشاداب اور نہروں کی کثرت والا خطہ ہے، موسم کی خوشگواری، کیلے اور سنترہ کی پیداوار کے لیے ممالک عرب میں اس کی شہرت ہے، ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل نے فلسطین پر ناجائز قبضہ کیا تو ان مقبوضہ علاقوں سے فلسطینی مہاجرین کی اکثریت نے اسی شہر میں پناہ لی تھی، تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ اموی خلفاء نے جاڑے کے موسم میں قیام کے لیے یہاں اپنے محل بنوائے تھے، ہشام بن عبدالملک کے محل کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں۔

زندگی کی صبر آزما شب: اردن سے سڑک کے راستے فلسطین میں ہم لوگ رات دس بجے کے قریب پہنچے تھے اور رات کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر بیت اللحم میں ہوٹل کے اپنے اپنے کمروں میں پہنچ گئے تھے، میری خواہش تھی کہ میں اسی وقت اسی حال میں قبلہ اول مسجد اقصیٰ اور شہر آرزو بیت المقدس میں حاضری دوں، لیکن ہمارے قافلہ کے لیے پہلے سے طئے شدہ ٹائم ٹیبل اور پروگرام کے مطابق پہلا دن ہمیں بیت اللحم میں دوسرا تیسرا دن جریکو میں اور تیسرا دن جمعہ کا بیت المقدس میں گذارنا تھا، میں نے کوشش کی کہ اکیلا ہی یا کسی ساتھی کو لے کر رات کو سونے سے پہلے ہی حرم ثالث کی زیارت ودید سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر دوں، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس گروپ ویزہ تھا اور ہمارے اپنے پاسپورٹ میں اس ملک میں داخلہ کے ثبوت کے لیے کوئی مہر لگی ہوئی نہیں تھی جس کو دیکھ کر چیک پوسٹوں پر موجود فوج کے ارکان سے اجازت لے کر ہم قبلہ اول میں داخل ہوتے، تمام کاغذات ہمارے فلسطینی رہبر کے پاس تھے، کہیں بھی آنے جانے کے لیے ہم اس کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھے اور وہ انفرادی طور پر کسی کے ساتھ کہیں جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا، چونکہ بیت المقدس بدستور اسرائیل ہی کے قبضہ میں ہے اور وہاں داخل ہونے کے لیے کئی چیک پوسٹوں سے گذرنا پڑتا ہے اس لیے ہزار خواہش کے باوجود ہم پہلے یا دوسرے دن وہاں حاضر نہیں ہو سکے اور تیسرے دن جمعہ تک ہمیں انتظار کے صبر آزما لمحات سے گذرنا پڑا، جمعہ کی رات اگلی صبح کے انتظار اور مسجد اقصیٰ کے دیدار کے اشتیاق میں جس طرح کی بے چینی میں گذری وہ بیان سے باہر تھی، وہ میری زندگی کی سب سے صبر آزما شب تھی جس

کے سیکنڈ بھی گذرنے میں مجھے گھنٹوں پر بھاری محسوس ہورہے تھے، اس لیے کہ کل فضل الٰہی سے میری زندگی کی اب تک کی سب سے بڑی خواہش پوری ہورہی تھی اور رحیم وکریم آقا میرا ایک دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر کررہا تھا اور مدتوں کی میری آرزو کی تکمیل کا وقت قریب تر ہورہا تھا، فجر کی نماز کے بعد ناشتہ سے اول وقت ہی میں ہوٹل کے ہال میں فارغ ہوکر ہم سب بس پر سوار ہوئے اور سوئے اقصی چل پڑے۔

دنیا کی سب سے اونچی آہنی فصیل سے گذر: جب ہم بیت اللحم سے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے تو دس پندرہ منٹ ہی میں ہماری بس ایک ایسے چیک پوسٹ پر آکر رک گئی جہاں دنیا کی سب سے اونچی آہنی فصیل یعنی شہر پناہ تعمیر کی گئی تھی کہ کم از کم پانچ منزلہ مکان اس کا مقابلہ کرسکتا تھا، اس کی موٹائی بھی اتنی تھی کہ ایک شخص آرام سے اس پر سوسکتا تھا، ہمارے گائیڈ سے معلوم ہوا کہ جو علاقے اب بھی بدستور اسرائیل کے قبضہ میں ہیں اور اکثریت میں یہودی اس میں آباد ہیں، فلسطینیوں کے خوف سے انہوں نے پورے ملک کے ایسے تمام شہروں میں ایسی آہنی فصیلیں تعمیر کروادی ہیں، جس میں بغیر اجازت وچیکنگ کے دوسری طرف رہنے والے فلسطینی اس میں داخل نہیں ہوسکتے، نہ اس کو کوئی آسانی سے اس کو توڑ کر یا سوراخ کرکے اندر گھس سکتا ہے اور نہ اس کو اس کی ۴۵/۵۰ فٹ اونچائی کی وجہ سے کسی کے لیے پھاند کر اس میں داخل ہونا ممکن ہے، ان سب کے باوجود اس شہر پناہ کے اوپر قریب قریب فاصلہ پر ہی حفاظتی مینار تعمیر کیے گئے ہیں جہاں چوبیس گھنٹے فوجی چوکس رہ کر اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں، مختلف تحقیقات اور تفتیش کے بعد خود بس پر سپاہیوں نے ہمیں آکر چیک کیا اور اطمینان ہونے کے بعد ہماری بس کو آگے بڑھنے کیلئے ہری جھنڈی دکھائی، اب ہم اللہ کا نام لے کر بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

شہر آرزو بیت المقدس میں: جب ہم نے اس مقدس شہر میں اپنے قدم رکھے تو تاریخ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں تھوڑی دیر کے لیے تاریخ کے صفحات میں کھو گیا، مجھے یاد آیا کہ اس شہر کی تاریخ چار ہزار سال پرانی ہے، سب سے پہلے آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے حضرت داؤدؑ نے جو حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین میں داخل ہوئے تھے اس شہر کو فتح کیا اور حضرت سلیمانؑ نے سب سے پہلی مسجد مسجد اقصی کے نام سے اس شہر میں تعمیر کی، چھٹی صدی قبل مسیح میں اس پر بخت نصر نے قبضہ کیا اور یہاں سے یہودیوں کو عراق جلاوطن کردیا، اس کے بعد یہ یونانیوں اور ایرانیوں کے قبضہ میں رہا، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو ۶۳۸ء میں فتح کیا، تب سے لے کر ۱۹۴۸ء تک یہ برابر مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا، سوائے ۸۸/سال کے جب اس پر عیسائیوں نے کچھ وقفہ کے لیے قبضہ کرلیا، لیکن جلد ہی ۱۱۸۷ء میں نامور مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اس کو دوبارہ فتح کرلیا، اس وقت پوری دنیا میں یہ تنہا شہر ہے جس کی تعظیم وتقدیس تینوں مذاہب اسلام، یہودیت اور

عیسائیت کے ماننے والوں میں برابر ہے، مسلمان قبلہ اول، حرم ثالث اور رحمت عالم ﷺ کے سفر معراج کی پہلی منزل ہونے کی وجہ سے اس سے جذباتی تعلق رکھتے ہیں، جب کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا پایہ تخت رہنے کی وجہ سے یہودی اور حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے عیسائی اس کا تقدس اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

موجودہ بیت المقدس: بیت المقدس کا اصل نام یروشلم ہے اور یہودی آج بھی اس کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں، جب مسلمانوں نے عہد فاروقی میں اس کو فتح کیا تو اس کا نام ایلیاء تھا، لیکن مسلمانوں نے یہ نام بدل کر اس کو القدس یا بیت المقدس کا پیارا اور خوبصورت نام دیا اور اسی نام سے وہ آج بھی اس کو موسوم کرتے ہیں، اسرائیل کے اس پر قبضہ سے پہلے ۱۹۴۷ء تک یہاں صرف ۳۶/ ہزار کی آبادی تھی اور اس میں یہودی صرف ۲/ ہزار چار سو تھے، ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے برطانیہ کی پشت پناہی سے اس مقدس شہر کے مغربی حصہ پر ناجائز قبضہ کیا اور ۱۹۶۷ء میں دوبارہ مسجد اقصیٰ والے بقیہ مشرقی حصہ پر بھی قابض ہو گیا، تب سے لے کر آج تک قبلہ اول اور حرم ثالث کو اپنے سینہ پر اٹھانے کی سعادت رکھنے والا یہ تاریخی و متبرک شہر بدستور اللہ کی مغضوب ترین قوم اسرائیل کے قبضہ میں چلا آرہا ہے اور کسی نئے صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں ہے۔

اس وقت اس کی آبادی آٹھ لاکھ کے قریب ہے، جس میں مسلمان صرف ۳۵/ فیصد ہی ہیں، جب کہ آج سے ۶۰/ سال پہلے تک مسلمانوں کا تناسب یہاں ۹۰/ فیصد سے زائد تھا، لیکن اس پر اپنے ناجائز قبضہ کے بعد لاکھوں مسلمانوں کو یہاں سے نہ صرف جلاوطن کیا گیا بلکہ ان کے گھروں اور محلات کو بلڈوزروں سے مسمار کر کے وہاں یہودیوں کے لیے کالونیاں تعمیر کی گئیں، یہ شہر اب دو حصوں میں بٹا ہوا ہے، ایک مشرقی بیت المقدس ہے جس میں مسجد اقصیٰ اور مسلمانوں کی اکثریت ہے، لیکن یہ نہایت پسماندہ ہے، دوسرا حصہ مغربی بیت المقدس ہے جس کو جدید بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے، اگرچہ قدیم و مشرقی بیت المقدس کا رقبہ زیادہ ہے لیکن زیادہ آبادی جدید اور مغربی بیت المقدس ہی میں پائی جاتی ہے جو ۱۹۴۸ء کے بعد بڑے منصوبہ کے ساتھ مختلف ملکوں سے لائے گئے یہودیوں پر مشتمل ہے، اکثر تجارتی مراکز، صنعتیں عالیشان و اونچی خوبصورت تعمیرات اسی حصہ میں ہیں جو اسرائیل کے قبضہ میں ہے، شہر کے دونوں حصوں کا مجموعی رقبہ ایک سو سات کلومیٹر ہے اور سطح سمندر سے ۷۳۲/ میٹر بلندی پر واقع ہے، یوں تو اسرائیل بیت المقدس ہی کو اپنی راجدھانی کہتا ہے لیکن عملاً و انتظاماً اس کا پایہ تخت تل ابیب ہے جو منصوبہ بند طریقہ پر بسایا گیا دنیا کا خوبصورت ترین اور ترقی یافتہ شہر مانا جاتا ہے، مشرقی بیت المقدس ۴/ کلومیٹر لمبی اور ۱۲/ میٹر اونچی فصیل سے گھرا ہوا ہے جس کی تعمیر عثمانی یعنی ترکی دور میں ہوئی ہے، مغربی بیت المقدس میں اسرائیل کی وہ عبرانی یونیورسٹی بھی ہے جس نے چار ہزار سال پرانی عبرانی زبان کو دوبارہ اس طرح زندہ کیا ہے کہ پورے اسرائیل کی یہ سرکاری زبان بن گئی ہے، پورے ملک میں

اس وقت عبرانی زبان ہی میں تجارتی وسرکاری بورڈ نظر آتے ہیں اور انگریزی زبان کی تحریر بہت کم دیکھنے کوملتی ہے شہر کے اسی حصہ میں وہ مزار بھی ہے جو جبل صیہون پر واقع ہے اور جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں حضرت داؤدؑ مدفون ہیں، اسی طرح اس میں عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ جگہ بھی ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی کا آخری کھانا یعنی عشائیہ تناول فرمایا تھا جس کو آج کل وہ قاعۃ العشاء الاخیر کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس شہر کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت آج کل یہ بتائی جاتی ہے کہ دنیا میں صرف اسی شہر میں تین دن سرکاری چھٹی ہوتی ہے، جمعہ کو مسلمانوں کی وجہ سے، سنیچر کو یہودیوں اور اتوار کو عیسائیوں کی وجہ سے۔

پہنچا جو حرم کی چوکھٹ پر، اک ابر کرم نے گھیر لیا: بیت المقدس شہر میں ۱۳۶/ ایکڑ وسیع خطہ پر پھیلے ہوئے حصہ کا نام حرم ثالث ہے جس میں واقع مختلف مساجد اور عمارتوں میں سے ایک مسجد اقصیٰ بھی ہے، حرم کا یہ خطہ شہر بیت المقدس کی مشرقی پہاڑی پر واقع ہے اور پرانے بیت المقدس کے ۱۵/ فیصد حصہ کو گھیرے ہوئے ہے جس طرح آج کل مسجد نبوی پورے قدیم مدینہ منورہ سے زائد حصہ کو گھیرے ہوئے ہے، ہم لوگ علی الصباح اپنے ہوٹل سے نکلے تھے، لیکن مختلف چیک پوسٹوں سے گذرنے کی وجہ سے ۱۰/ بجے کے قریب حدود حرم میں داخل ہوئے، حرم ثالث کا یہ پورا علاقہ پتھر کی اونچی چار دیواری سے گھرا ہوا ہے اور اس کے آس پاس دہلی میں جامع مسجد کے اطراف کی طرح پرانے طرز کے محلات آباد ہیں جہاں ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں کھلے بازار میں دوکانوں سے باہر رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور جس کے اکثر مالک مسلمان ہیں، اندر داخل ہونے کے لیے اطراف واکناف میں کھلے دروازوں کے بڑے بڑے گیٹ ہیں جو مختلف گلیوں کے کنارے بنے ہوئے ہیں، زبانوں پر ذکر الٰہی اور دلوں میں شکر خداوندی کے ساتھ جب ہم حدود حرم میں داخل ہوئے تو اس کی دلکش، جانفزا اور معطر فضاؤں نے عجیب وغریب فرحت ومسرت کے جذبات سے سرشار کیا اور کرہ ارض کی اس مقدس زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں خود اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا، ہمارے گائیڈ کی ہدایت کے مطابق ہم نے سب سے پہلے حدود حرم میں موجود تاریخی مقامات ومساجد کی زیارت کی، تاکہ مسجد اقصی مںی داخل ہونے کے بعد جمعہ سے پہلے ہمیں باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہو اور ہم یکسوئی سے نماز جمعہ تک عبادت میں مشغول رہ سکیں۔

مولانا محمد علی جوہر کے مزار پر: ہندوستان میں تحریک آزادی کے مشہور رہنماء اور تحریک خلافت کے قائد مولانا محمد علی جوہر ۱۹۳۱ء میں ملک کی آزادی کے سلسلہ میں انگریزوں سے گفتگو کے لیے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن اس اعلان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ یا تو میں ملک کی آزادی کا پروانہ لے کر آؤں گا یا پھر وہیں میری موت ہوگی، چنانچہ ان کی آرزو کے مطابق اسی سال ۱۵/ شعبان کو برطانیہ ہی میں ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا اور ان کی خواہش ووصیت کے مطابق ان کا جنازہ بیت المقدس لے جایا گیا اور حدود حرم میں مسجد اقصی کے صحن میں دائیں

طرف وفات کے بیس دن بعد پانچ رمضان ۱۳۴۹ھ کو اس خوش قسمت عالم دین کی تدفین عمل میں آئی، اس وقت ان کا مقبرہ ایک بند کمرہ میں ہے اور کمرہ سے باہر محمد علی ہندی کے نام سے تختی لگی ہوئی ہے، ہم نے وہاں حاضری دی اور ان کے لیے ایصال ثواب کیا، اسی مرقد سے متصل کمرہ میں فلسطینی انقلاب کے قائد اور عظیم اسلامی مجاہد شیخ عبدالقادر حسینی بھی مدفون ہیں جن کی شہادت یہودیوں سے لڑتے ہوئے ۱۹۴۸ء ہی ہوئی تھی۔

قبۃ الصخرہ کے دلکش ماحول میں: جس تاریخی اور محبوب گنبد کو بچپن سے دیکھا کرتے تھے اور جس کے دید کے تصور ہی سے آنکھیں بے قرار ہوتیں تھیں اور ہوا کے دوش پر اڑ کر وہاں پہنچنے کی حسرت ہوتی تھی آج ارحم الراحمین آقا نے محض اپنے لطف وکرم سے اس گنبد کے روبرو مجھے پہنچا دیا تھا، مجھے اپنی گناہوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی بیداری کی حالت میں اس قبۃ الصخرہ کو اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں جس کی دید کی حسرت کے ساتھ لاکھوں نہیں کروڑوں اللہ کے نیک اور مخلص بندے اس دنیا سے چلے گئے، کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ میں خواب میں ہوں، لیکن جلد ہی اپنے رب کی مجھ پر ہونے والی بے پناہ رحمتوں کی استحضار کے ساتھ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے کریم مالک نے آج واقعی مجھے اس پاکیزہ خطہ میں پہنچا دیا ہے جہاں کی حاضری میری زندگی کی اور دنیا کی آخری خواہش کہی جاسکتی ہے۔

قبۃ الصخرہ ایک گول چٹان ہے جہاں سے اللہ کے رسول ﷺ معراج کے موقع پر آسمان پر تشریف لے گئے تھے، حرم کے وسط میں اسی چٹان پر تعمیر ایک نہایت پرشکوہ وخوبصورت ترین گنبد کا نام اب قبۃ الصخرہ ہے جس کا ظاہری حسن میں سوائے گنبد خضری کے دنیا کے کسی گنبد سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا، اس چٹان کے متعلق عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ شروع میں یہ چٹان زمین سے کچھ اوپر معلق تھی، میں نے اندر جا کر غور سے اس چٹان کو دیکھا تو یہ تقریباً پانچ فٹ اونچی زمین پر پتھروں پر کھڑی تھی، لیکن اس کے درمیان شگاف کے مانند خلاء ضرور تھا، یہ چٹان گنبد کے بالکل نیچے بھی نہیں ہے بلکہ ایک غار کے اندر ہے جہاں جانے کیلئے کچھ سیڑیوں سے نیچے اترنا پڑتا ہے، اس غار اور چٹان کے درمیان چاروں طرف تقریباً پندرہ فٹ خالی جگہ ہے، اس طرح اس میں بیک وقت ۶۰/۵۰ آدمی کھڑے ہو سکتے ہیں، غار کی چھت دس فٹ قریب اونچی ہے، اس گنبد کو اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۶۹۱ء میں تعمیر کیا اور اس کو تین سال میں مکمل کیا، اس میں داخلہ کے لئے چار دروازے ہیں، باہر سے سورہ یٰس کی آیات لکھی ہوئی ہیں، گنبد زمین سے تقریباً ۱۲۰ فٹ اونچا ہے، مسجد اقصیٰ میں خواتین جماعت میں شریک نہیں ہوتی ہیں بلکہ اسی قبۃ الصخرہ سے وہ امام اقصیٰ کی امامت میں نماز ادا کرتی ہیں چونکہ یہ جمعہ کا دن تھا اس لئے پورا قبۃ الصخرہ خواتین سے بھرا ہوا تھا جو تلاوت وذکر الٰہی میں مشغول تھیں، کچھ جگہوں پر بعض خواتین درس بھی دے رہی تھیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: اس وقت پورے عالم اسلام میں اکثر مسلمان تصویر میں اسی قبۃ الصخرہ کو دیکھ کر مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں اور مسجد اقصیٰ کے نام سے اسی گنبد صخرہ کی تصویریں عام ہورہی ہیں، یہ دراصل ایک منصوبہ بند سازش لگتی ہے کہ اگر بالفرض اللہ نہ کرے یہودی مسجد اقصیٰ کی شہادت کے اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوجائیں تو وہ قبۃ الصخرہ کو اپنی اصلی حالت میں دکھا کر عوام الناس کو یہ باور کراسکیں کہ ہم نے تمہاری مسجد اقصیٰ کو چھوا تک نہیں، وہ اب بھی اپنی جگہ باقی ہے، اسی طرح عوام کا ایک بڑا طبقہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کو بھی ایک ہی سمجھتا ہے جب کہ بیت المقدس ایک شہر کا نام ہے اور مسجد اقصیٰ اس شہر میں موجود حرم ثالث کی ایک مسجد کا۔

قبۃ النبی کی روح پرور فضاؤں میں: مسجد اقصیٰ میں داخل ہوتے ہوئے بائیں جانب کسی قدر فاصلے پر کچھ سیڑھیوں سے اتر کر ایک تہہ خانہ ہے جس کو قبۃ النبی یا قبۃ المعراج بھی کہا جاتا ہے، ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ نے شب معراج میں اسی جگہ انبیاء کرام کی امامت فرمائی تھی اور اسی کے قریب آپ نے اپنے گھوڑے کو باندھا تھا جس کی علامت کے طور پر وہاں ایک گول کڑا اب بھی موجود ہے، تہہ خانہ میں یہ پوری جگہ الحمدللہ اب بھی اسی حالت میں ہے، یہ سن کر مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ غار حرا، غار ثور اور جبل احد میں اس غار کے بعد جس میں آپ ﷺ نے زخمی ہونے کے بعد پناہ لی تھی یہ شاید دنیا کی چوتھی جگہ ہے جس پر آپ کے قدم مبارک پڑے تھے اور وہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسی حالت میں ہے، اس تصور کے بعد اس جگہ عبادت میں میرا جی لگنا اور دیر تک یہاں بیٹھے رہنے اور ذکر وتلاوت میں مشغول رہنے کے لئے طبیعت کی آمادگی فطری بات تھی، مسجد اقصیٰ کے بعد سب سے زیادہ جی میرا اسی جگہ لگا اور اس میں زیادہ دیر تک رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دیوارِ گریہ کے پاس: حرم شریف کی مغربی دیوار کا ایک پچاس فٹ طویل حصہ جو مسجد براق سے متصل ہے دیوار گریہ کہلاتا ہے، یہودی یہاں آکر ہیکل سلیمانی (حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کردہ عبادت گاہ) کی یادتازہ کرتے ہوئے آہ وبکاء کرتے ہیں اور اس پر اپنا سر ٹیک کر روتے ہیں اور تورات پڑھتے ہیں اسی لئے اس کا نام دیوار گریہ یعنی الحائط المبکی پڑگیا ہے، اس کے متعلق یہودیوں کا دعویٰ وگمان ہے کہ یہ دیوار حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کردہ عبادت گاہ ہیکل سلیمانی یعنی پہلی دفعہ تعمیر کردہ مسجد اقصیٰ کی عمارت کی باقیات میں سے ہے اور اسی عمارت کا یہ بچاہوا حصہ ہے جس کو چھٹی صدی عیسوی میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے منہدم کردیا تھا، حرم شریف کے اندر سے بھی اس دیوار گریہ کو دیکھا جاسکتا ہے لیکن یہودیوں کو حرم کے اندر آکر یہاں عبادت کی اجازت نہیں، وہ مسجد اقصیٰ کی چہار دیواری کے باہر سے آکر وہاں جمع ہوتے ہیں، اس سے چمٹتے ہیں اور اس پر اپنا ماتھا ٹیکتے ہیں، ہم نے جمعہ بعد باہر سے جاکر بھی اس حصہ کو دیکھا، وہاں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ہاتھوں میں تورات کے نسخے لے کر عبادت میں مشغول تھی۔

جامع عمر (اسلامی رواداری کی ایک یادگار): مسجد اقصیٰ کے حدود سے باہر حدود حرم میں ایک تاریخی مقام جامع عمر یا مسجد عمر ہے جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں یوں ملتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی فتح کے بعد وہاں حاضری دی تو عیسائی راہب نے ان کو اپنا کنیسہ یعنی چرچ دیکھنے کی دعوت دی جس پر آپ وہاں تشریف لے گئے، اسی دوران مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو راہب نے کنیسہ ہی میں نماز پڑھنے کی درخواست کی لیکن آپ نے وہاں نماز نہیں پڑھی بلکہ اس کی سیڑھی پر نماز ادا کی، پھر آپکو اچانک خیال آیا کہ مسلمان میرے اس عمل کو دیکھ کر کہیں اس گرجہ کو مسجد نہ بنائیں، چنانچہ آپ نے اسی وقت کاغذ منگوا کر یہ تحریر لکھی کہ میرے اس عمل کو دیکھ کر مسلمان اس گرجہ میں تصرف نہ کریں، حضرت عمرؓ کی رواداری کے اس عمل سے متاثر ہو کر عیسائیوں نے اس گرجا گھر کے قریب بیس قدم کے فاصلہ پر ایک مسجد تعمیر کی جو بعد میں جامع عمر کے نام سے موسوم ہوئی۔

مدعی سست گواہ چست: ان سب تاریخی مقامات کی زیارت کے بعد ہم لوگوں کیلئے اب وقت اپنے مقصود مسجد اقصیٰ کی زیارت اور اس کی فرحت بخش فضاؤں میں داخلہ کا تھا، حرمین شریفین کی الحمدللہ بار بار حاضری اور جمعہ کے دن صبح ۱۰ بجے جانے پر بھی اندر تل دھرنے کی جگہ نہ ہونے کے عینی مشاہدہ کی وجہ سے مجھے خدشہ تھا کہ حرم ثالث میں بھی کچھ یہی حالت ہوگی لیکن جب ہم تمام زیارتوں سے فارغ ہو کر اپنی تمناؤں کے مرکز مسجد اقصیٰ پونے بارہ بجے پہنچے تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں تھی کہ پوری مسجد میں تین صف کے بقدر مصلین بھی نہیں تھے جبکہ اذان جمعہ کے لیے صرف چالیس منٹ کا وقت باقی رہ گیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ بیت المقدس (یروشلم) شہر کے باہر رہنے والے فلسطینیوں کو پہلے سے اسرائیلی حکومت کی طرف سے جاری کیے گئے داخلہ پاس کے بغیر اس میں آنا اور نماز میں شریک ہونا مشکل ہے اور چالیس سال سے کم عمر کے لوگوں کو اس میں داخلہ بھی نہیں دیا جاتا، لیکن خود بیت المقدس میں رہنے والے ان فلسطینی مسلمانوں کو جن کی تعداد تین لاکھ سے اوپر ہے اور اس میں داخلہ کیلئے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے جمعہ کے دن اقصیٰ کی روحانی فضاء میں قبل از وقت آنے کیلئے کونسی چیز رکاوٹ بن رہی تھی، جیسے ہی اذان ہوگئی پوری مسجد بھر گئی، جو لوگ اذان کے بعد آسکتے تھے ان کیلئے آدھا گھنٹہ پہلے حاضری کیوں کر ممکن نہیں تھی، اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ فلسطین کی نئی نسل میں مسجد اقصیٰ کی وہ عظمت نہیں ہے جو سارے عالم اسلام کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، پوری دنیا کے گناہگار سے گناہگار مسلمان بھی جس کا نام ہی سن کر اور اس کی تصویر ہی دیکھ کر آب دیدہ ہو جاتے ہیں اور وہاں پہنچنے کے شوق میں انکے جذبات کی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے خود وہاں کے رہنے والے مسلمانوں میں اسکی عقیدت کے وہ مظاہر کیوں نہیں ہیں، اس کی اصل وجہ بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ یہ ہے کہ یہ لوگ اقصیٰ وقدس کی آزادی و واگزاری کو اپنا نسلی، قومی اور تہذیبی حق سمجھتے ہیں، نہ کہ اسلامی، دینی اور ملی فریضہ، دراصل ان کا یہی نظریہ بیت المقدس کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے، ان فلسطینیوں نے اس کو عالم عربی کا مسئلہ سمجھا ہے نہ کہ عالم

اسلام کا، حالانکہ اس کی اہمیت عالم عربی سے زیادہ عالم اسلام کو ہے اور اسی کے عالمی پلیٹ فارم سے ملت کے اس اہم ترین مسئلہ کو حل کیا جاسکتا ہے، دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ بیت المقدس کی آزادی کیلئے خود وہاں رہ کر لڑنے والے فلسطینیوں سے زیادہ دور رہ کر اس کے لیے کوشش کرنے والے عالم اسلام کے مسلمانوں اور ہمیشہ اپنے رب کے حضور اس کی واگزاری کیلئے التجائیں و دعائیں کرنے والے اہل ایمان کے دل میں اس کی عظمت واحترام اور عقیدت ومحبت کے نقوش پائے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں تحریک حماس کے زیر اہتمام لڑنے والے ان باحوصلہ، غیرت منداور دین دار مسلم فلسطینی مجاہدین کا استثناء کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اس کو ہمیشہ اپنا قومی وعربی مسئلہ سمجھنے کے بجائے عالم اسلام کا مسئلہ سمجھا ہے اور اس کے لئے کی جانے والی کوششوں میں پوری دنیا کے مسلمانوں کو شامل رکھا ہے، بالفاظ دیگر جن بھائیوں کی طرف سے اقصیٰ کے حصول کے لئے پوری دنیا میں مسلمان کوشاں ہیں اور جن کو سب سے زیادہ اس کی عظمت ومحبت کا حامل ہونا چاہیے وہ سست ہیں یعنی مدعی سست گواہ چست کا معاملہ ہے۔

"اقصیٰ پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا": ہم لوگ پاؤنے بارہ بجے اللہ کا نام لیتے ہوئے اور اس نعمت کے حصول پر اس کا برابر شکر بجالاتے ہوئے مسجد اقصیٰ کے مرکزی دروازہ سے داخل ہوئے یا یوں کہیے کہ ہم مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے بعد اس روئے زمین کے سب سے بابرکت خطہ فلسطین کے سب سے مقدس شہر بیت المقدس کے پرنور قطعہ ارض، حرم ثالث کے سب سے افضل ترین حصہ میں الحمدللہ پہنچ گئے اور ہماری دنیاوی حسرتوں کی آخری کڑی بھی پوری ہوگئی اس پر ہم اسی ذات کا شکر بجالارہے تھے جس کی محض توفیق واحسان سے ہی اپنی زندگی کا یہ روحانی وتاریخی دن ہم یہاں گذار رہے تھے اور جس میں ادا کی جانے والی ایک نماز پر پانچ سو نمازوں کے وعدہ خداوندی کے تصور ہی سے اپنے آپ کو جنت ارضی میں محسوس کررہے تھے۔

حرم ثالث کے حدود میں قبلہ کی جانب جو سب سے بڑی مسجد ہے وہی مسجد اقصیٰ ہے، اس کی بناء حضرت داؤدؑ نے رکھی تھی اور حضرت سلیمانؑ نے اس کو مکمل کیا تھا، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی ، موجودہ عمارت کی تعمیر کا آغاز اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ہوا اور اس کے بیٹے ولید بن عبدالملک کے عہد میں چھ سال میں ۶۹۲ء میں اس کی تکمیل ہوئی، اس وقت اس کی دیکھ بھال کے لئے تین سو آدمی مقرر کیے گئے تھے، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ موجودہ عمارت کی بنیادیں بھی حضرت داؤدؑ ہی کی رکھی ہوئی تھی، چھ ستونوں پر قائم یہ پوری مسجد اسلامی فن تعمیر کا ایک پروقار اور پرشکوہ نمونہ ہے، تب سے لیکر اب تک بارہ سو سال گذرنے کے بعد بھی پوری مسجد اسی حالت میں ہے، ۲۱ راگست ۱۹۶۹ء کو ایک عیسائی مائیکل روہن نے ظالم یہودیوں کے اشارہ پر اس کو آگ لگائی تھی جس کی وجہ سے مسجد کے جنوبی حصہ کو بڑا نقصان پہنچا تھا لیکن شمع رسالت کے پروانوں نے اپنی جان پر کھیل کر اس کو مکمل نذر آتش ہونے سے بچایا، جس کے بعد اس کی از سر نو تعمیر کے بجائے اسی حالت میں رکھ کر اس کی جزوی اصلاح و

مرمت ہی پر اکتفا کیا گیا، آتش زنی کے اس واقعہ کے بعد عالمی سطح پر مسلمانوں کا جو اتحاد دیکھنے میں آیا اس کی نظیر ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی، اسی سال مسلم ممالک کی تنظیم اسلامی کانفرنس وجود میں آئی اور عالم اسلام میں یہودیوں کے خلاف عوامی غیض وغضب کی ایسی ہوا چلی کہ دنیا دیکھتے رہ گئی، لیکن مسلم حکمرانوں نے بعد میں مسلم امت کے ان اسلامی جذبات اور عوامی ملی احساسات کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے اس مسلم تنظیم کا رول بھی بعد میں عالم اسلام میں روز بروز گھٹتا چلا گیا۔

مسجد اقصی ۲۶۲/ فٹ لمبائی اور ۱۸۰/ فٹ چوڑائی پر مشتمل ہے، یعنی مجموعی رقبہ ۴۷/ ہزار مربع فٹ ہے، جس میں اندازاً چار ہزار افراد بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، مسجد کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے، اندر داخل ہونے کے لیے کل گیارہ دروازے ہیں، مسجد کے عین وسط میں ایک خوبصورت گنبد ہے جس کی اونچائی تقریباً ۴۰/ فٹ ہے جو باہر سے بھی دکھائی دیتا ہے اور مسجد اقصی کی تصویر میں بھی نمایاں نظر آتا ہے، جب ہم مسجد میں داخل ہوئے تو عجیب فرحت ومسرت محسوس ہورہی تھی، عقیدت ومحبت کے جذبات کا اظہار لبوں پر مسلسل جاری شکر خداوندی کے کلمات سے ہورہا تھا، میری کیفیت گناہوں میں مسلسل ڈوبے ہوئے ہونے کی وجہ سے رحمت خداوندی سے اس مقدس جگہ پر پہنچنے کے بعد اقبال عظیم کے الفاظ میں کچھ یوں تھی:

جبیں افسردہ افسردہ ،قدم لغزیدہ لغزیدہ نظر شرمندہ شرمندہ ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

اذان جمعہ میں ابھی دیر تھی، قبلہ کی طرف محراب کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر ایک قاری صاحب بڑی خوش الحانی سے سورہ کھف کی مائک پر تلاوت کررہے تھے، لوگوں نے بتایا کہ جمعہ کے دن خطبہ سے بہت پہلے مائک پر یہاں قرأت کا معمول زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے، وہ جب اپنی قرأت سے فارغ ہوئے تو دوسرے قاری صاحب نے مائک سنبھالا، لیکن وہ بے ریش تھے، یہ سلسلہ وقفہ وقفہ سے مختلف قاریوں کے ذریعہ اذان جمعہ تک چلتا رہا جس کی وجہ سے ہم اپنی تلاوت نہیں کرسکے، مجھے پونے بارہ بجے پہنچنے کے باوجود چوتھی صف ہی میں آسانی سے جگہ مل گئی، تقریباً ساڑھے بارہ بجے مخصوص وضع قطع اور مصری طرز کے عمامہ کے ساتھ خطیب اقصی شیخ یوسف ابوسنینہ تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے، اور اذان شروع ہوئی، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مسجد نبوی کی طرح صفوں کے درمیان کچھ اونچائی پر ہی چھوٹی سی چھت پر مؤذن اذان دے رہے تھے افسوس کہ وہ بے ریش ہی تھے، جو یہاں کے مسلمانوں کے لیے ہم برصغیر کے مسلمانوں کے برخلاف حیرت وتعجب کی بات نہیں تھی، ہر ماہ جمعہ کے لیے یہاں چار خطباء اور روزانہ امامت کے لیے مختلف ائمہ مقرر ہیں، خطبہ بڑا جامع اور فصیح وبلیغ تھا، جو تقریباً ۲۰/ منٹ تک چلا، حرمین شریفین میں خطبات جمعہ میں مسجد اقصی کی واگذاری کے لیے کی جانے والی دعاؤں پر ہمیشہ آبدیدہ ہونے والی میری آنکھیں اس انتظار میں تھیں کہ خطیب اقصی کب اس کے لیے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجا کریں گے اور میری آنکھیں پھر ایک بار اشکبار

ہوگئیں، لیکن افسوس بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ صراحت کے ساتھ کس مصلحت کی وجہ سے سارے عالم اسلام میں جمعہ کی مساجد میں اس کی آزادی کے لیے کی جانے والی دعاؤں سے خود اقصی کی ان معطر فضاؤں کو خطیب اقصیٰ نے محروم رکھا، ہم گناہ گاروں کے لب مسجد اقصی کے لیے خود اقصی میں کی جانے والی اجتماعی دعاؤں والتجاؤں پر آمین کہنے کو ترستے رہے اور اخیر تک مجھے اس کا قلق رہا، امام کے سلام پھیرتے ہی عصر کی جماعت کا اعلان ہوا، میں حیرت میں پڑ گیا کہ اے اللہ: یہ کیا ماجرا ہے، نہ زوردار بارش ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک جمع بین الصلاتین کی جو اجازت ہے اس پر عمل ہو اور نہ یہاں نماز پڑھنے والے مصلین کی اکثریت ان مسافروں کی ہے جن کے لیے جمع تقدیم کا جواز ہو، خیر میں تو شافعی المسلک مسافر تھا، اس لئے میں نے عصر کی نیت سے جماعت میں شرکت کی، لیکن مسجد میں موجود ان ۹۰/ فیصد مصلیوں کی جو اسی علاقہ کے رہنے والے تھے عصر کی جمع تقدیم میں شرکت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، معلوم ہوا کہ یہ عمل یہاں سالوں سے چلا آ رہا ہے، غالباً یہاں حاضر ہو کر جمعہ ادا کرنے والے ان مسافروں کے لیے اس کا آغاز کیا گیا تھا جن کو عصر تک یہاں رہنا مشکل تھا، ان کو عصر کی جماعت کے ثواب سے محروم نہ رکھنے کے لیے شاید یہ سلسلہ شروع ہوا تھا، لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے یہاں مقیم غیر مسافروں نے بھی گنجائش نہ ہونے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا، سنتوں کے بعد میں نے خطیب صاحب سے ملاقات کی اور ان سے مختصر گفتگو بھی ہوئی، جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ہندوستانی اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا شاگرد ہوں تو بڑی مسرت کا اظہار کیا اور خوب دعائیں دی، چونکہ نماز جمعہ سے پہلے یکسوئی سے مجھے دعا کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے سنتوں سے فراغت کے بعد میں محراب کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور بہت دیر تک دعا میں مشغول رہا اور اپنے تمام بزرگوں اساتذہ، گھر والوں اور ان دوستوں وغیرہ کا نام لے کر دعائیں کی جنھوں نے اس مقدس سفر کے موقع پر مجھ سے اس کی درخواست کی تھی، جب میں واپسی کے لیے باہر نکل رہا تھا تو اقصی کے فراق وجدائی پر طبیعت بے قرار و بے چین اور آنکھیں اشکبار تھیں اور میری کیفیت کچھ یوں تھی: کیا مانگ لیا، کیا بھول گیا ، باقی رہا نہ ہوش مجھے

مصلی مروان میں: دیوار گریہ سے متصل حدود حرم میں مسجد اقصی میں داخل ہوتے وقت بائیں جانب ایک تہہ خانہ ہے جس کے اوپر ایک گنبد بھی ہے، جس کو مصلی مروان کہا جاتا ہے، اس کی نسبت یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ کو پیدائش کے بعد لے کر آئی تھی، بعد میں صلیبی جنگوں میں یہ گھوڑوں کا اصطبل بن گیا، مروان نے دیوار گریہ کے اس طرف سے یہودیوں کو حدود حرم میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے یہاں ایک مصلی بنایا جو بعد میں اسی کے نام سے منسوب ہوا۔

اقصی کے اردگرد کھدائی کی ناکام کوشش اور تابوت سکینہ کی تلاش: یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ مصلی مروان کے نیچے ہی کہیں تابوت سکینہ دفن ہے، یہ دراصل حضرت موسیٰؑ کے عہد کا وہ صندوق ہے جس میں حضرت موسیٰؑ

اوران کے گھر والوں کی مقدس یادگاریں تھیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے، دشمنوں کے ساتھ جہاد میں بنی اسرائیل ہمیشہ اس صندوق کو جو تابوت سکینہ کہلاتا تھا سب سے آگے رکھتے تھے، جس کی برکت سے ان کو فتح حاصل ہوتی، بعد میں دشمنوں نے اس کو ان سے چھین لیا جس کے بعد ان کو پے در پے شکست ہونے لگی، یہاں تک کے حضرت داؤدؑ نے طالوت بادشاہ کے زمانے میں جالوت کو ختم کر کے یہ صندوق ان سے واپس لے لیا، یہودیوں کا خیال ہے کہ ہیکل سلیمانی (جس کی ازسرنو تعمیر کے یہودیوں کے منصوبہ کا آج پوری دنیا میں چرچا ہو رہا ہے) یعنی حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ عبادت گاہ کو جب منہدم کیا گیا تو اس کے ملبہ میں اس تابوت سکینہ کو بھی انہوں نے کھو دیا تھا، ان کا گمان غالب یہی ہے کہ یہ اب بھی مسجد اقصی کی ان بنیادوں میں کہیں مدفون ہے جس کو بعد میں حضرت عمرؓ نے تعمیر کیا تھا، مسجد اقصی کے انہدام کے یہودیوں کے ناپاک عزائم اور منصوبوں اور کوششوں کے پیچھے دراصل اسی تابوت سکینہ کی تلاش اور اس جگہ ازسرنو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا ناقابل تعبیر ان کا خواب ہے، اسی لیے مسجد اقصیٰ کے اردگرد اپنے قبضہ والی زمینوں سے زیرزمین سرنگوں کے ذریعے وہ بار بار اقصی کی بنیادوں کو کمزور کر کے اس کو گرانے کی ناپاک کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس کے لیے کھدائی کا عمل دہراتے رہتے ہیں اور آئے روز اخبارات میں اس سلسلہ کی خبریں ہمیں سننے کو ملتی رہتی ہیں، اس سلسلہ میں ان ناپاک عزائم کے حامل ان بدقسمت یہودیوں کو اسرائیلی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔

بحرمیت کے کنارہ (دنیا کی سب سے بڑی عبرت گاہ یا عشرت گاہ):

فلسطین کے اس پورے قیام بلکہ مشرق وسطی کے اس پورے سفر میں جس جگہ حاضر ہو کر میرے دل کو سب سے زیادہ چوٹ لگی وہ بحرمیت کا ساحل تھا، بحرمیت دنیا کا تنہا ایسا سمندر ہے جس کا تعلق کسی بھی دوسرے بڑے عالمی سمندر سے نہیں یعنی وہ کسی سے جا کر نہیں ملتا، تقریباً اسی کلومیٹر طویل سمندر ہے جو جریکو شہر سے دس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اس کی چوڑائی مختلف علاقوں میں ۵ رسے ۱۵ رکلومیٹر تک ہے، اس پورے علاقہ میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں سیدنا لوطؑ کی قوم آباد تھی اسی نام سے بعد میں وہ قوم لوط کہلائی، یہ قوم ایک غیر فطری عمل اور گناہ کی اجتماعی طور پر مرتکب تھی اور اپنی فطری خواہشات کی تکمیل کے لئے مردوں میں مردوں سے ہم جنسی اور لواطت کا عمل جاری تھا، ان کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ کو مبعوث فرمایا لیکن اخیر تک یہ قوم اس خبیث اور گھناؤنے عمل سے باز نہیں آئی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس پوری بستی کو آسمان پر اٹھا کر الٹ دیا اور پھر زمین پر پٹخ دیا جس سے اس اسی کلومیٹر کے خطہ میں آباد پوری یہ بستی ہلاک ہوگئی جس کے بعد ان کی اس زمین کے اندر موجود پانی اوپر آگیا اور سمندر کی شکل اختیار کر گیا اور پوری قوم زمین بوس ہوگئی، ان کے لئے دی گئی اس عبرت ناک سزا کو قیامت تک آنے والوں کیلئے بطور عبرت اللہ تعالیٰ نے اس سمندر کی شکل میں باقی رکھا، زیرزمین موجود اس پانی کے اوپر آنے کے بعد بھی اس پانی میں اس قوم کی نحوست کے اثرات باقی ہیں، اس لیے چار ہزار سال پہلے دنیا کے نقشہ میں آنے والے اس سمندر میں کوئی مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لیے اس کو بحر مردار یا بحرمیت (Dead Sea) کہا جاتا ہے، اس میں نمکینی اس

قدرت ہے کہ عام انسان اس میں تیرتے ہوئے ڈوب نہیں سکتا چونکہ آسمان پر لے جا کر اس کو زمین پر پٹخ دیا گیا تھا اس لیے زمین کے بہت نیچے یہ بستی چلی گئی اور آج بھی یہ خطہ روئے زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے اور سطح سمندر سے ایک ہزار تین سو فٹ نیچے واقع ہے، سمندر کی گہرائی تیرہ سو فٹ ہے یعنی اسمیں ایک سو تیس منزلہ عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے یہ سمندر نصف فلسطین میں ہے اور نصف اردن میں واقع ہے، ہم لوگ جب اس تاریخی سمندر اور عبرت گاہ دیکھنے کیلئے لرزیدہ قدموں کے ساتھ وہاں پہنچے تو ہمارے پیروں تلے زمین کھسک گئی، جہاں انسانوں کو اللہ کی پکڑ اور گناہوں پر سزا کا خوف ہونا چاہئے تھا وہاں سب سے زیادہ خدا کو بھلا کر پھر اس کی نافرمانی کی جارہی تھی اور بحرمیت کا یہ سمندر عبرت گاہ کے بجائے عشرت گاہ بنا ہوا تھا، مرد و خواتین بغیر کسی تمیز کے اس سمندر میں نیم برہنہ ہی نہیں بلکہ تقریباً برہنہ حالتوں میں تیراکی کر رہے تھے اور پورے فلسطین میں سب سے زیادہ سیاحوں کی بھیڑ اسی جگہ نظر آرہی تھی، افسوس اس بات کا تھا کہ اس تفریح گاہ میں آنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اور وہ خود بھی اس عیاشی میں ملوث نظر آرہے تھے، ایک عجیب بات وہاں جا کر سننے کو ملی کہ اس سمندر کے پانی میں شفاء ہے، اسی لیے مختلف جلدی امراض سے نجات پانے کے لیے بھی لوگ بڑے بوڑھے تک اس میں تیراکی کرتے ہیں بلکہ اللہ کے عذاب والی زمین کی اس مٹی سے جو دیکھنے میں بھی نہایت سیاہ رنگ کی لگتی تھی بڑے شوق سے اپنے بدنوں کو ملتے ہیں، یہ تو فلسطین میں واقع بحرمیت کے نصف ساحل کی بات تھی، اردن میں تو اس کے کنارے پر ایسے فائیو اسٹار ہوٹل بنائے گئے ہیں، جہاں پورے ملک کے سب سے مہنگے کرایہ والے کمروں کے لیے مہینوں پہلے بکنگ ہوتی ہے اور یہ مشرق وسطی میں عیاشی و فحاشی کا ایک بہت بڑا اڈا بن گیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

غزہ میں حاضری سے محرومی: غزہ کے علاقہ میں جو پورے فلسطین میں اپنے اعتبار سے سب سے ممتاز شہر ہے، ہم اپنی شدید خواہش کے باوجود نہیں جا سکے، اسرائیل نے اس کا معاشی ناکہ بندی کے ساتھ محاصرہ کر لیا ہے، کوئی بیرونی امداد وہاں نہیں پہنچ سکتی اور نہ کوئی تجارتی سامان وہاں درآمد کیا جا سکتا ہے، اس کے باوجود ان فلسطینیوں کے حوصلہ پست نہیں ہوئے ہیں، وہ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود اسرائیل کی مسلح حکومت کا جینا دوبھر کر دیا ہے، یہ محاصرہ اسرائیلی فوج کے غزہ پر دو سال قبل ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ء کو فوجی کاروائی کے بعد ہوا ہے جس میں اب تک ایک ہزار پانچ سو سے زائد فلسطینی جام شہادت نوش فرما چکے ہیں، ایک طرف سے غزہ کی سرحد مصر سے بھی ملتی ہے لیکن افسوس کہ مصری مسلم حکمرانوں نے اسرائیل سے بھی بدتر معاملہ اپنے ان مسلم محصور فلسطینی بھائیوں کے ساتھ روا رکھا ہے، غزہ میں الفتح کی نہیں تحریک حماس کی حکمرانی ہے جن سے وابستہ فلسطینی پورے ملک میں اپنی دینی پہچان کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔

مجموعی تاثر: فلسطین جیسی ارض مقدس میں حاضری کے بعد جس چیز نے سب سے زیادہ میرے دل کو چوٹ پہنچائی وہ وہاں مقیم نئی نسل کی دین بیزاری، شریعت سے دوری اور اسلامی شعائر کے احترام میں ان کی کمی تھی، یہ سن کر

آپ کو یقیناً حیرت ہوگی کہ فلسطینی طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد آج کل یہودی نوجوانوں سے شادیاں کررہی ہیں جو ان کے نہ صرف سب سے بڑے دینی و مذہبی بلکہ نسبی دشمن بھی ہیں، بیت اللحم میں جہاں ہمارا قیام تھا اور مسلمانوں کی بڑی آبادی جہاں مقیم ہے مسجدیں بہت کم ملیں اور جہاں ملی مشکل سے صف دو صف نمازی نظر آئے، مسجد اقصیٰ میں جمعہ کے دن اذان جمعہ سے پہلے ان کی حاضری کے تناسب کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں، فلسطینیوں کی خاص وضع کی کالی وسفید بیل بوٹوں والی رومال جسے یاسر عرفات اہتمام سے اپنے سر پر اوڑھتے تھے اور جو پوری دنیا میں فلسطینیوں کی پہچان تھی اس رومال کو اوڑھے مشکل سے پانچ چھ عرب ہمیں نظر آئے اور وہ بھی عمر کے آخری مرحل میں تھے، عربی لباس میں فلسطینیوں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی رہیں، پورے چار دن میں آٹھ دس عمر رسیدہ عرب ہی ایسے نظر آئے، لباس اور وضع قطع میں یہودیوں اور فلسطینیوں میں فرق کرنا مشکل ہے، جوان مسلم طالبات بھی پینٹ اور ٹی شرٹ کی عادی ہیں، مسلم ہوٹلوں میں بھی استنجاء اور قضائے حاجت کے لئے پانی کا انتظام نہیں مشرقی طرز کے بیت الخلاء ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، مہاجر فلسطینیوں کو جب ان سے ہمدردی کی وجہ سے دوسرے ممالک میں مسلم کمپنیاں اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھتی ہیں تو وہ اس آمدنی کو اپنی چھٹیوں میں یورپ کے عشرت کدوں میں جاکر خرچ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ان کی اولادیں یورپ وامریکہ کے مشنری اسکولوں میں زیر تعلیم ہوتی ہیں، ایک دن بیت اللحم میں مغرب کی نماز کو جاتے ہوئے ہمارے ہوٹل سے قریب نوجوانوں کی ایک بھیڑ چوراہے کو جھنڈوں سے آراستہ کررہی تھیں، تحقیق سے معلوم ہوا کئی سالوں کے بعد آج ان کے ایک دوست کی جیل رہائی ہورہی ہے اور اس کے استقبال کے لئے یہ سب انتظامات کئے جارہے ہیں، جب میں نماز پڑھ کر واپس آیا تو ان نوجوانوں کو بیچ سڑک پر کھڑے ہوکر ہولڑ بازی کرتے ہوئے پایا، مسجد قریب ہونے باوجود بھی ان میں سے ایک دو نوجوان بھی جماعت میں شریک نہیں ہوئے، فلسطین میں ایک بڑی تعداد میں عیسائیوں کی آباد ہے جو اکثر مسلمانوں ہی کے محلوں میں رہتے ہیں، اسی طرح بیت المقدس شہر میں بھی یہودیوں اور مسلمانون کی مخلوط آبادی ہے، ان میں دعوتی کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے اور حکمت وخاموشی سے ان کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کیا جاسکتا ہے، لیکن افسوس کے اس پر توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اسی طرح فلسطینیوں میں جو بے دینی اور بے حیائی نئی نسل میں عام ہورہی ہے اس پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس وقت جو کچھ دینداری ان میں پائی جاتی ہے وہ تحریک حماس اور دعوت وتبلیغ کے یہاں آنے والے وفود وجماعتوں کی برکت سے ہے، جس نے ان فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو اب بھی دین وشریعت سے وابستہ رکھا ہے۔

مذکورہ بالا مختصر دعوتی تجزیہ کے بعد ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ بیت المقدس کی پاک زمین کو یہودیوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنے میں نصرت خداوندی کے آنے میں تاخیر کیوں ہورہی ہے۔